

ابھی بہت عرصے تک اسے وقار حاصل نہیں ہو سکے گا جو اکثر عمارتوں کو وقت کے ساتھ ساتھ مونموں کے گدم و سرف سے گزرنے کے بعد جایا کرنا ہے۔

بہر حال اب جب کہ اپنے بیل اس شہر کے تنخے سے صرف کمر کی طرح مٹ پڑتا ہے۔ اور ڈولی اور اس کے پروانے افسارین پکے ہیں، صندلی بلی غائب ہو چکی ہے، اس عمارت کو برقرار رہنا چاہیتے۔ ایک وقت آتے گا کہ اس کی منڈی یہیں کافی لگ کرہ سیاہ ہو چکی ہوں گی اور پرندے اپنی کب کب کی ہوتی سفید و سیاہ بلیوں کے پیچ گاؤں کے ساتھ بدھتا کریں گے۔

تنے زمانوں کی جنگلوں کا ایک نقشان یہ ہے کہ وہ عمارتوں کو عظمت حاصل نہیں کرتے وہیں۔ اونچی اونچی عمارتیں براقی نہیں ہوتے پاہیں کہ کوئی جنگ پھر جاتی ہے اور عبار طیار اہمیت سماں کر رہا تھا ہیں۔ جنگ کے بعد شہروں کی نئے سرسے سے متصورہ بندی ہوتی ہے اور پہلے سے زیادہ اونچی عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ مگر ابھی وہ نئی ہوتی ہیں کہ پھر کوئی جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ ان کے گرد عظمت اور اسرار کا ہالہ بننا جاتے گا کہ کہ ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

#### ۸۔ دسمبر

کل رات تو مدد ہی ہو گئی۔ ڈائنس میں لکھ چکنے کے بعد میں بیٹھا، فوراً ہمیں نگاہ گئی مگر مخفی

ہی دیر بعد امی نے جھپٹوڑ کر جگادیا۔ بیٹھے اس ائمہ نجح رہا ہے۔“

میں پھر رات بھر ہسی ہوتا رہا۔ جانے کتنی ہار سائز بجا ہیں بہت ڈرا۔ ڈرایہ سوچ کر کہ اس شہر کو جہاں میں نے اتنے دکھے ہیں، جہاں بیٹھ کر میں نے روپ نگار کو اتنا یاد کیا ہے اور اپنے تصور میں اب تک، زندہ رکھا ہے، اسے آگہ کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا میں اپنے دکھوں کو یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ بستی برباد ہوتی ہے تو اس کے ساتھ وہ دکھ بھی فراموش ہو جاتے ہیں جو وہاں رہتے ہوئے لوگوں نے بھرے ہوتے ہیں۔ اس جنگ زدہ عہد کا المیہ یہ

ہے کہ ہمارے دکھ، ہماری یادیں نہیں بن باتے۔ جو عمارتیں، جو مقام ان دکھوں کے میں ہوتے ہیں انہیں کوئی ایک بُم کا گولہ م کے دم نیست ونا یوڑ کرہ دیتا ہے۔

میں اس قدر کے لئے اور کچھ نہیں سکتا، دعا کر سکتا ہوں، سو کرتا ہوں یہ میرے تصور  
میں آبا دروپ نگار کے لئے بھی دعا ہے کہ اسے میں اب اس شہر سے الگ کر کے تصور میں نہیں لا  
سکتا۔ روپ نگار اور یہ شہر میرے اندر گھل مل کر ایک بستی میں کئے ہیں۔

- 9 -

سڑک کو اس شہر میں عبور کرنا اب چنان مشکل نہیں رہا۔ جنگ کی پہلی صبح کو میں نے کس مشکل سے سڑک عبور کی تھی۔ مگر پھر کتنی چلہتی طریقہ کا زور ٹوٹ گیا۔ دن گزرتے گئے، طریقہ کم ہوتا گیا، رکشاوں کا شورا بـ۔ لکھاں کم ہو گیا ہے اور لوگوں کی بیخ و پکار بھی کمی کیمی لگتا ہے کہ شہر میں اب صرف بس کی سواری ملتی ہے کہ پر سواری اسی پہلے تو اتر کے ساتھ سڑک سڑک روں نظر آتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب، اس کے فٹ پورڈ پر سواریاں لکھی دکھاتی نہیں دیتیں اور اندر لوگ ڈنڈا اپکرٹے کھڑے نظر نہیں آتے۔ ہتوڑی سواریاں واپس نہیں۔ کسی بس ٹینڈے پر سجوم بھی دکھاتی نہیں دیتا۔ ہاں جیسے ہوا تی جملہ کا سائمن بجتا ہے اور طریقہ کے پیاس، ہی سیطیاں بھلتے یعنی سڑک پر آ جاتے ہیں تو سڑک کے دونوں طرفوں میں سواریوں کی قطار میں لگتی جاتی ہیں۔ اس وقت احساس ہوتا ہے کہ شہر میں رکشا تین اور ٹیکسیاں ہنوز چل رہی ہیں۔

شام پڑے کہ فیکا اعلان کرتی ہوئی سیٹیوں کے ساتھ جب بیس میں مگر بوٹتا ہوں تو اسی تجھے سے شہر کا حال پوچھتی ہیں اور ملے کا حال سناتی ہیں کہ آج فلاں مگر کے لوگ فلاں شہر چلے گئے ہیں۔ روز صبح کو خواجہ صاحب دکوان سے پردشک دستیے ہیں اور ٹولانگ روم میں اطمینان سے پیٹھ کر جتھے کے گھونٹ بچکر سیٹی سیٹی سفر کر کے آتی ہوئی کسی نئی فتح کی خبر سناتے ہیں، اور روف محلے کے ایک اور مگر بیس تالا پڑا انظر آتا ہے۔ روز ای جانے والوں پر تبصرہ کرتی ہیں

آج اسی کچھ زیادہ گھبرائی نظر آتی تھیں «اسے ہے کیا ملے میں، ہم لکیتے ہی رہ جائیں گے؟»  
 «ذاکر کی ماں۔» ابا جان ممتاز کے ساتھ بولے «موت ہر چوڑک ہے اس سے بھاگ کر دی  
 کہاں جا سکتا ہے۔ حضور کی حدیث ہے کہ جو موت سے بھاگتے ہیں وہ موت ہی کی طرف  
 بھاگتے ہیں۔»

میں جملن ابا جان کو تکنے رکا۔ یہ تو وہی بات ہے جو ابا جان نے دادی اماں سکھی تھی  
 جب روپ نگہ میں وبا پھیلی تھی اور لوگ ٹھروں کو بھوڑا چھوڑ کر نگہ سے باہر جا رہے تھے۔  
 دو فرد ہمارے ٹھر سے بھی رخصت ہوئے ہیں۔ ہمارے صحن میں ایک امرود کا پڑیڑ ہے  
 بیتے ہوتے یہ مسٹریں بلبلوں کا ایک جوڑا سونگھتے سونگھتے یہاں پہنچا اور ہمیں کا ہو رہا۔ اسی ان  
 بلبلوں سے بہت شیراز تھیں «اسے ان کجھتوں نے امرودوں کا ناس کردا الہ خدا پکتا ہے۔ تو  
 اس میں چرچخ مار دیتی ہیں کسی امرود کو جو پورا پکتے دیا ہو۔»

«راجی! درختوں سے اُنزوں نے ولے رزق میں پرندوں کا بھی توحہ ہوتا ہے۔»  
 اسی نے مجھے گھوڑ کے دیکھا «یہ اچھی رہی کہ دکھہ ہم پھر میں اور کھا میں چڑی میں طوڑتے»  
 گھر لایا وہ بلبلیں کہاں ہیں۔ جنگ کی پہلی صحیح کو وہ دنوں بلبلیں اڑتی اڑتی آئیں اور  
 امرود پر اشتر پڑیں رکس ذوق و شوق کے ساتھ پکتے امرودوں کا پہنچی چرچخ سے جاتنہ لے  
 رہی تھیں کہ گھن گھن کے ساتھ ایک یہاذا اور سے گز رہا۔ دنوں حساس باختہ امرودوں کو  
 چھوڑا ڈال گیکیں۔

امرود ہمارے درخت میں اب بہت پکتے ہیں۔ اسی روز نتوڑ کہ چاٹ بناتی ہیں  
 اب کسی امرود پر کسی چرچخ کا نشان نہیں پوتا۔ ہمارے گھر کے ہوتے وہ نہمان، ہمارے  
 پھلوں کے رزق میں وہ حصہ دار جا چکے ہیں۔

آج شیراز سے نکلتے نکلتے شام ہو گئی۔ بس کرفیر میں بھوڑا وقت باقی تھا کہ میں نے چائے کا  
 آغزی گھوڑت، لیا اور باہر نکلا۔ باہر خلقت بھاگ چل جا رہی تھی سواریاں۔ پہٹ دوڑ

رہی تھیں۔ موڑ، تالاگے، سکوڑ، ٹیکسی، رکشا۔ میں عذر سا چاہوا تھا جیسے کوئی فلم کا شروع تھا ہو۔ میں بھی بہت سبب ہوئی۔ دن بھر تو سڑکیں خالی پڑی رہتی ہیں سواریوں کا یہ سیلاب کمال سے انتہا آیا۔ کن او جمل را ہوں پر یہ سواریاں چل رہی تھیں کہ اچانک مال روڈ پر کچھ آئی ہیں۔ میں نے کتنے رکشا والوں کو پکار لگکر سی نہیں ستا کوئی نہیں رکا، حالانکہ وہ رکشائیں خالی تھیں۔ سواریوں کے بجوم میں پھنس کر ایک رکشا میرے قریب آگئے رکی میں نے رکشا والے کی منت کی توبلا:

« باو باغناپورے چلنا ہو تو چل۔»

« باغناپورے کس خوشی میں؟»

« ایں خوشی میں کہ میوں گھر پہنچا ہے اور یہیون بنجھے والا ہے۔»

تب میں نے سوچا کہ سواری کی تلاش میں مزید وقت صائع کر ناٹے سود ہے۔ اس وقت سب کو اپنی پڑی ہے۔ بہتر ہی ہے کہ پیدل چل پڑا، رستے میں ممکن ہے اُدھر جاتی ہوئی کوئی رکشا مل جاتے یا کوئی چھلانگ میں موڑ سواریوں کی اکر لفڑ دے دے۔

شام کے چھپٹے میں دکانوں کے شرط ایک شور کے ساتھ جلدی گردہ ہے تھے۔ دکاندار بھیٹ پٹ تالا گتا، بہ جاوہ جا۔ کوئی موڑ بیں، کوئی سکوڑ پر، کوئی پیدل۔ دونوں وقت بجلی کی روشنی کے شرمندہ احسان ہوتے بغیر مل رہے تھے۔ اندر ہیراد ہیرے دھیرے سڑکوں اور گلیوں میں پھیل رہے تھا۔ یونہی بچھے خیال آیا کہ گئرے رے دکانوں میں روز شام کوئی بچھے ہو۔ اکثر ہو گا۔ جنگلوں میں زندگی کا یہ چراغ زمانہ، جب شکاری دن بھر شکار کیتے کے بعد شکار کے بوچھے کے ساتھ شام پڑ نے سپلے پھے اپنے اپنے غاروں میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔ وہ زمانہ جب جہاں بستیاں آباد ہوئی تھیں اور چراغ جلنے لگے تھے، جب بیتی دالے دن کی روشنی میں سارے کام کاچ کرنے کے بعد دن ڈھلنے لمبے لمبے دُگ بھرتے ہوتے گھروں کی طرف چلتے کہ چراغ میں بنتی پڑتے سپھٹے گھر پہنچ جائیں۔ وہ زمانہ جب بڑے

شہر آباد ہو گئے تھے اور شہروں کے گرد فصلیں کچھ گئی تھیں، جب قافلہ دیکھتے سورج تک  
پہنچا آباد گرم را ہوں پورے سفر کھلچکھے منزل گزرتے مرات پڑنے سے پہلے شہر میں داخل  
ہونے کی کوشش کرتے جو قافلہ مست قدم ہوا اس نے شہر کے دروازوں کو بند پایا اور  
بے اماں کالی رات فضیل کے ساتے میں سیر کی۔

جنگ نے شہر کی زندگی کو درمیں برم کر دیا ہے۔ میرے اندر زمانے اور زمانیں درم و  
بر، تم ہیں۔ کبھی کبھی بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کہاں کس جگہ میں ہوں۔ دن ڈھلن چکا، شام ہوتے  
کوئے، جنگل کے رستے سنسان ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ڈگ بھترنا اپنے غار کی طرف جا رہوں۔

#### ۱۰۔ دسمبر:

کالج میں کلاسیں والاں نہیں تو ہوتیں نہیں، اس سے چھو کر شہزاد میں آن بیٹھتا ہوں۔ چھر  
عرفان آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی افضل عینی آن دھمکتا ہے۔ سلامت اور اجمل دکھانی نہیں دیتے  
گلر سنا ہے کہ وہ القلبی سے خوب وطن بن گئے ہیں اور سپاہیوں کے لئے تھے جمع کرتے  
پھرتے ہیں، ہم سے تو وہی اپنے رہے۔

ہم سے کیا ہو سکا ہجت میں

شہزاد میں بیٹھ کر باقی کر لیتے ہیں، باقیں بھی اول ٹیکا۔ آج میں عرفان سے کہنے لگا: یا را  
تمہاری اخبار نویسی سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔“

”کیا فائدہ چاہتے ہو؟“

”یا را تمہارے پاس کہہ فوپاں ہوتا ہے، اخبار کی گاڑی ہوتی ہے، تم مجھے بلیک آٹھ میں  
شہر نہیں دکھا سکتے۔“

”دکھا سکتا ہوں۔ مگر بلیک شاد آباد شہر کو سنسان صورت میں دیکھنے کے لئے ہمت چاہیئے۔“

”وہ ہم نے اس شہر میں اتنے کہ فیودیکے ہیں۔ کیا اب بھی یہ ہمت پیدا نہیں ہوتی؟“

”کرفیوں میں شہر کو دیکھنے کا تجربہ الگ ہے۔ یہ تجربہ اس سے بالکل مختلف ہے۔“

افضال یچ میں بول پڑا: "عرقان ٹھیک کتا ہے۔ مت دیکھ۔ ڈر جائے گا۔"

"دیکھا ہے یا بے دیکھ کہ رہے ہو؟"

"کا کے ادیکھا ہے جب کہہ رہا ہوں۔" رکا، اور پیر ایسے بولا جیسے ڈرا ہوا آدمی بولتا ہے پر سو تا  
جب عرقان نے اپنی دفتر کی گاڑی میں مجھے بھرپور خواہا تھا تو میں سنسان اندر ہیری سڑکوں سے گزرتے  
ہوئے دایکنی کی عمارتوں کو دیکھتے سے دیکھ رہا تھا۔ ہر عمارت گم سخان جیسے اندر کوئی نہ ہو مجھے لگا  
کہ یہ لوگوں کے مکان نہیں، پھر ہوں کے بل میں پور ہے ڈر سمنے بیٹھے ہیں۔ میں ڈر گیا۔"  
افضال مجھ سے بڑھ گیا۔ مجھے اپنے محل کے گھر جب میں رات میں کبھی گلی میں نکل کر نظر ڈالتا  
ہوں، اندر ہیری میں پیٹھے آوارہ بے آہڑے ایسے نظارے ہیں جیسے غار ہوں۔

## ۱۱۔ دسمبر:

غار میں بیٹھا ہوں۔ باہر کالی رات منہ کھوئے کھڑی ہے۔ سارے،  
سیلیاں، کتوں کے بھونکتے کی آوازیں، انسانی آواز ندارد۔ جیسے لوگ کہیں، حرث کر گئے  
ہوں۔ جنگ کے طلب میں بندھا شہر کبھی کبھی اس پاس کے سارے سکتے اس زور شو سے بھونکتے  
ہیں کہ لگتا ہے میرے غار میں گھس آئیں گے۔ پھر چپ پہ جلتے ہیں لگہ دور سے آوازیں آتی رہتی  
ہیں۔ رات کو جنگل میں ہیfer کرتے ہوتے ہی کچھ ہوتا ہے۔ دور کی ان دیکھیں، ان جانی سیلیوں سے  
مسئلہ بھونکتے ہوتے کتوں کی آوازیں آتی ہیں، آتی رہتی ہیں۔ ایک حصہ سا بیان جاتا ہے جیسے  
آدمی بھونکتے کتوں کے حصہ میں پل رہا ہے۔ جیسے پورے کرہ ارض کے گرد کتوں نے گھر لڑالا ہوا  
ہے۔ میں خوف کے حصہ میں ہوں اپنے غار سے دور یچ جنگل میں سرمائے اور زمینیں میرے  
اندر درہم و برہم ہیں۔ میں کہاں پل رہا ہوں؟ کس زمانے میں؟ کس زمین میں؟ ہر سو ہی ہر مقام  
پر اسٹری جنگل سے نکل کر سیلی میں آیا۔ گرگی سیلی میں؟ آدمی نہ آدم زاد۔ سنسان کو چھکا ہیران  
کلیاں، دکانیں بند، جیلیاں مغلل۔ عربیہ وابیں دہننک جیران جیران پھر تارہ۔ آخر الامر ایک بڑے

پھانگوں والی حویلی کو دینکہ کمیجھے کچھ اس ہوتی کہ شاید اس کے اندر لوگ ہوں میں نے دشک دی اور چلا یا: ”کوئی ہے؟“

جواب ندارد۔ پھر زور سے دشک دی اور اونچی آواز سے چلا یا:

”کوئی ہے؟“ اس میری آواز کی گونج ہی مجھے ستائی دی۔ مجھ پر وہشت غالیب آگئی۔ دل میں کہا کہ اس بستی سے نکل چلو۔ مبادا کوئی انتاد آپڑتے۔ یہ سوچتا تھا کہ دیکھتا ہوں کہ ایک چھیل ہے۔ پانی چھیل کا کچھ اجلہ کچھ گلا۔ چھیل کیے سچوں نیچ ایک ہاتھی اور ایک کچھو اکہ ایک دوسرا سے لڑ رہے تھے گمراہ دونوں میں سے نہ کوئی غالب آتا تھا۔ مغلوب ہوتا تھا۔

میں جہاں کھڑا اس لڑائی کو دیکھتا تھا کہ ایک مرد فیکر نہ دار، وہ چھیل کے قریب پہنچا کر سکر ہاتھی اور کچھو سے پر ایک نظر افسوس بھری ڈالی اور ایک آہ سرد لکھنخی۔ پھر کہا کہ کاش و علم سے محروم ہوتے اور زبانیں ان کی یہ ناتیز ہوتیں۔

فیکر کے اس سکتے تھے جیسے جہاں کیا۔ میں اس کے روپ و پہنچ کر دست بستہ عرض پر دانہ ہوا کہ اے مرد بزرگ تو تے کیا دیکھا اور کیا جانا کہ ایسا کلمہ زبان پہلا یا؟ وہ بولا کہ اے عزیز برو، آدمی میں چیزوں کے ہاتھوں خار ہوتا ہے!

عورت کے ہاتھوں جب وہ وقار اندھو، بھائی کے ہاتھوں جب وہ حق سے زیادہ لائے، علم کے ہاتھوں جب وہ ریاضت کے بغیر حاصل ہو جاتے اور زمین تین چیزوں سے پہ آرام ہوتی ہے:

کم ظرف سے جب اسے مرتباً مل جاتے، عالم سے جب وہ نرپست ہو جاتے حاکم سے جب وہ نظام ہو جاتے۔

میں یہ سن کر اس بزرگ کا منہ تکنے لگا اور اس کے بیان کی تھی کونا خن فہم سے سلجنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب نہ سلچا سکا تو عرض پر دانہ ہوا کہ اسے بزرگ اس تعیم کی تھیں کہ

تب اس نے مجھ سے پوچھا کہ عزیز رونے اس بستی کو کیسا دیکھا؟ میں نے کہا کہ بزرگ امیں نے اس بستی کو یہ آباد دیکھا۔

تب وہ مرد فقیر بیوی گویا ہوا کہ عزیز داستان اس بستی کی بیوی ہے کہ والی اس کا ایک مرد نیک انسجام تھا۔ دولت دینیک ساتھ دولت روحانی سے مالامال تھا۔ جب اس کا وقت آخر ہوتے رکھا تو اس نے اپنے فرزندوں کو کہ لگتی تھیں دو تھے، پاس بلکہ باری باری سینے سے لگایا۔ طبیعت اس کی اس سے ہلکی ہوتی بولائے بیٹوں میں نے علم اپنا نام دلوں کے یعنی مساوی تقسیم کیا اور اسے بیڑے بیٹوں! تم نیسرے بعد میرے اس یا قی تر کے کو بھی آپس میں اسی طور تقسیم کرنا کہ میں ڈرتا ہوں اُس دن سے کتم اپنے حق سے زیادہ طلب کرہ اور خلن گذا کے لئے عذاب بن جاؤ۔

ایسا کہ اس مرد نیک فال نے آخری سائس بیا اور اس داروغانی سے عالم جاودا نی کو کوچھ کہ دیکھا۔ دلوں بیٹوں نے اس کا بہت سوگ کیا، پہ جب نتر کہ تقسیم کرنے بیٹھے تو پاپ کی وصیت کو بھول گئے اور اپنے اپنے حق سے زیادہ مانگنے لگے۔ اس پر جھگڑا ہوا جھگڑا اکھتے کرتے دلوں نے پاپ سے پانے ہوتے علم کے زور پر ایک دوسرے کے لئے بد دعا کی۔ پڑے نے ختم آلو دنیوں سے چھوٹے کو دیکھا اور بد دعا کے لجے میں کہا کہ تو کچھوا ہے۔ چھوٹے نے نفرت سے بڑے کو دیکھا اور بد دعا کے لجے میں کہا کہ تو بد مست ہا ہتھی ہے۔ سوس کے بعد چھوٹا کچھوابن گیا اور بڑے نے بد مست ہا ہتھی کاروپ دھار لیا۔ تب سے دلوں غصے میں دیو اتے ہو رہے ہیں اور لٹڑ رہے ہیں۔

یہ تصدی عترت سن کر میں نے استفسار کیا کہ اسے بزرگ انسجام اس طراحتی کا کیا ہو گا؟ بولائے جھیل کا پانی لگدا ہو جاتے گا میں نے کہا کہ وہ تو ہو چکا ہے۔ بولائے اور ہو گا میں نے پوچھا لتنا کہ کہا اتنا کہ جھیل دلدل بن جاتے گی اور سیتی میں خاک اڑتے گی۔

یہ خوفناک کھا کے اس ٹھنڈا راستی سے نکلا۔ چلا آباد بستی کے کھوچ میں جنگل جنگل پھرتا۔

پھر اندھا کرنے والیسا ہوا کہ دور آبادی کا نشان نظر آیا۔ اسی راہ پر طیار قریب پہنچا تو کیا دیکھا۔ ایک نئی مردم بوم شہر خوب، افضل مرغوب۔ باخون میں اشجار نمر وار انواع و اقسام کے، مگل بھول زمگ رنگ کے، طامین خوش المahan شاخ شاخ، غزالی صبار قفار روشن روشن۔ خوشبو کوچے، مغرب گلیاں بالا روان میں حکوم سے کھوا چلتا ہے، کٹورا بجتا ہے۔ سترخ لینگاں باندھے مشکیں کاندھوں پر لادے چھڑ کاڑ کرتے چلے جاتے ہیں۔ بہتی پھر پھر کٹور سے آب کو شپالاتے ہیں۔ وکائیں صاف شفاف صراف کے مقابل صراف۔ بالا غائب، آئینہ خانے، کوئی نازک پدمی جھوٹنے میں بھولتی ہے آئرسی میں اپنارو تے زیبا دیکھتی ہے۔ کھنچے اللہری میں۔ کوئی شہر خوبی آب رواں کا پیرا ہیں پہنچنے ہوئے کہ صاف ادھر سے نظر آتا ہے اور کھلا پہلو۔ کسی گل روکا عالم یہ کہ آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پر مسی کی دھڑری، سبنتہ چھپ کا پڑتا ہے، ڈوپٹہ ڈھلک ڈھلک جاتا ہے۔ پیٹ مندل کی تختتی، ناف سوتے کی پیالی، پیڑو جیسے پیڑے۔ آگے پردہ داری ہے۔ شرم کی عمل داری ہے۔ قیاس کن ریگستان میں بہار مرا جس کی قسمت یا اوری کی ہے اور ہمت ساتھ دے وہ غوطہ بارے اور گنگا نہلے ہمٹ کو شناوری مبارک۔

ایک دفعہ تو میں الٹا لیلہ کا ابوالحسن بن گیما۔ گلی کوچوں میں چھڑتا تھا اور حیران ہوتا تھا مگر فتنہ رفتہ آنکھیں کھلیں، عجب منظر نظر آیا۔ حق دق رہ گیا جس سر پر نظرگئی اسے غائب پایا۔ آدمی مجھ سلامت، کھوپڑی غائب۔ دل میں حیران کہ یہ خواب ہے یا عالم بیداری۔ آنکھیں مل کے دیکھا، پھر وہی منظر۔ یا الٹا ان لوگوں کی کھوپڑیاں کہاں گئیں؟ ویزناں کچپ دہ۔ آخر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا۔ ایک راہ گیر سے کہ آدمی سن رسیدہ تھا اور صورت سے ثقہ نظر آتا تھا، استفسار کیا کہ اسے صاحب کیا تھا اسے شہر میں آدمی کے کھوپڑی نہیں ہوتی۔ اس مرد معمر نے چرت سے مجھے سر سے پیزناں دیکھا اور کہا کہ اسے شخص! لگتا ہے تو اس شہر میں اجنبی ہے کہ ایسا سوال کرتا ہے۔ سوتاگہ نہیں جانتا تو بھی چپ رہ اور جانتا ہے تو بھی چپ رہ کہ دیوار گوش دارہ۔ پھر وہ بزرگ مجھے اپنے گھر لے گیا اور خوب مدارات کی، پھر کہا کہ اسے عزیز! سن کہ ہماری کھوپڑیاں ہمارے یادشاہ

کے سانپوں کی خذابین گئیں۔ یہ سن کر میں بہت یہ راں ہوا۔ تب اس بزرگ نے وصاحت کی، اسے مرے عزیز بنا اس کے ہمایہ سے با دشاد کے شانوں پر دیکنیں یا یہنیں دوسارے مستقل پہنچا رتے رہتے ہیں، آدمی کی کھوپڑی اس کی خذابی ہے۔ روز اس شہر میں قرعد اندازی ہوتی ہے، روز دو آدمی پکڑتے جاتے ہیں اور ان کی کھوپڑیاں نہ اٹھ کر جعلاتہ الملک کے سانپوں کو کھلانی جاتی ہیں اور اسی اس شہر میں لگنتی کے لوگ رہنگئے ہیں جن کی کھوپڑیاں ابھی پائی ہیں۔ مگر تابکے؟ جس کی کھوپڑی کل نہیں تراشی گئی تھی اس کی آج تراشی گئی، جس کی آج نہیں تراشی گئی اس کی کل تراشی جائے گی اور اس کو کل گجرد نوبت نہ کے گی اور بعد اس کے قرعد اندازی ہو گئی۔

یہ قصہ ہو شریان میں وسطِ بحیرت میں عرق ہوا جب رفتہ رفتہ اوسان بجا ہوتے تو شوی  
تجسس چاکا اور بگرد موقعاً وادا سپر جانے کے لئے مستعد ہوا۔ مرد میرنے لوگا تو کام کے  
ناعاقبت انلیش اپنی جوانی پر رحم کھا اور اس فعل سے باز آئیں تو با دشنا کی رعیت ہوتے کہ یہ کھل  
دیکھنے پر مجبور ہیں۔ تو تا خی اپنے تین خطرے میں ڈالتا ہے با دشنا مکاری تجھے دیکھیں گے اور ترا  
نام بھی لکھ لیں گے اور قر عمر میں شامل کریں گے۔ روکنے سے میری آتش شوق اور بھڑکی۔ بینگ کی  
نصیحت پر مطلقاً کانہ دھرا۔ لیں۔ یہی سودا سریں سمایا کہ چل کے دیکھیں آج قدرت کیاں گل غلطی  
ہے، قضاکس کے سر پر کھلیتی ہے۔

محل کے مقابلہ پہنچا تو کیا دیکھا کہ ایک اڑد ہام ہے، جمیع خاص و عام ہے۔ امیر و عزیز ب، شریف و وضیع، محتاج و عنی، نگارگرو و تو نگر، بنیے بنقال، امراء و وزراء رسپ، اکھٹے ہیں اور تھے کے پیشے کا انتظار رکھ رہے ہیں۔

جب نام نکلے تو خلقت دم بخود ہوئی۔ سب ایک دوسرے کامنہ تکلنے لگے، لفافِ افسوس ملنے لگے، آہ و بھاکر نہ لگے۔ بیں نے مردِ عمر سے پروچاک قضاۓ بن بندپیسوں کو منتخب کیا ہے کہ لوگ اتنی واپسیا کر رہے ہیں تھس پر اس نے ایک ٹھہڑی آہ کھینچی اور یوں گویا ہوا کہ اسے عزیز! آج جن دو کے نام نکلے ہیں وہ دربارِ دربار کے منتخب والش مند ہیں۔ عالیٰ فکر، روشن ملغ

ذہن رساپا یا ہے علم و فضل میں کیتا ہیں؛ بھر حکمت یہ کہ خواص ہیں۔ دانش میں ان کی دھرم ازروم تاشام ہے۔ مملکت کے روز سچھتے ہیں بڑی سے بڑی گھنی کو ناخی تدبیر سے سلحا دیتے ہیں۔ اب جو وہ اپنی کھوپڑیوں سے خودم ہوئی گے تو جراغ حکمت کا بھج جائے گا، شہر بے دانش ہو جائے گا۔ آہ ویکا بے سود ہتھی، قرعہ کا نتیجہ قسمت کا لکھا تھا۔ اسے کون ٹال سکتا تھا۔ کھوپڑیاں دونوں دانش مندوں کی تراشی گئیں اور سانپوں کے سامنے طشت میں رکھ کر پیش کی گئیں۔ سگر سانپ مہ ماڑ کہ الگ ہو گئے اور فڑ غضب سے چینپھنا نہ لگے۔ یادشاہ نے مقربوں کو عصے سے دیکھا اور پوچھا تک حرامو! تم نے اس غذتے لطیف کے ساتھ کیا ملا دیا کہ سانپ اسے نہیں کھلتے اور غصے میں چکن کارتے ہیں۔ مقرر ہیں تے دست بستہ عرض کیا کہ جہاں بنناہ، ہماری کیا جمال کہ عالی مقام سانپوں کی خدا میں کوئی آمیزش کریں۔ سگر یہ کہ وہاں ہے کیا جو سانپ تناول کرنے کی کھوپڑیاں ان منتخب و گوارشمندوں کی مفرز سے خالی ہیں۔

اس خالی ڈھنڈا رنگ سے زیادہ اس آیا دشہر سے میں نے خوف کھلایا جیسے تیسے لپ پچپ کہ دہاں سے نکلا۔ کھوپڑی کے سلامت سے آتے پر پاک پروردگار کا شکر ادا کیا۔ میں پھر قریون شہروں بستیوں کا خیال چھوڑا، ویرانوں میں پھرنا پھرا۔ پھرنا پھر۔ ہاں ہوں کیمی دشت بے آب و گیاہ میں کبھی گھنے جنگلوں میں بستیاں ہکتوں کی آفاؤں کی راہ، تعاقب کتے جا رہی ہیں۔ جنگل میں میں نے کوئی کتا نہیں دیکھا۔ کتنے بستیوں میں ہوتے ہیں بستیوں اور ان کے نواح میں بھوکتے ہکتوں کی آوازیں رات کو جنگل میں اس طرح آتی ہیں جیسے سب بستیوں کے سب کئے جنگل کی طرف مہ کر کے ہمونک رہے ہیں۔ میں حصار سے میں ہوں جنگل کے پاروں طرف بستیاں پھیلی معلوم ہوتی ہیں۔ چاروں طرف سے ہکتوں کی آوازیں آرہی ہیں جیسے بڑا اسادا رہ بنا کہ میری طرف منہ کر کے ہمونک رہے ہیں جنگل کی رات کتنی لمبی ہوتی ہے۔ میں اپنے غار سے کتنی دور، میں۔ سانہن کی آواز، بستیاں، ستائیں۔

«بیٹے! لا لیٹن بیجادو، کہیں روشنی باہر نہ جا رہی ہو۔» اجی جان ڈری آواز میں کھنچی ہیں۔

کہ کبیں ان کی آواز طیاروں تک نہ پہنچ جاتے۔

”بھی اچھا“

میں الیٹن بھلنے لگا ہوں۔ غار میں مکل انہیں ہونا چاہیے۔

۱۱۲۔ دسمبر:

دن کی سب باتیں دن کے ساتھ یسرگئیں، اب رات ہے اور میں ہوں جنگ کی رات لکھنے یعنی ہوتی ہے اور پھر ہی نہیں لتا۔ جیسے جنگل میں یہیں ہے ہیں اور صدیوں سے سفر کر رہے ہیں۔ جنگل کا سناٹا اور صدیوں کا سکوت، سوئی بستیوں میں کتے جنگلوں میں گیٹ۔ ان کی آوانیں کائنات کی نیدر کوتوڑتی نہیں، انکا کرتی ہیں۔ سوئی بستیاں، سوئی صدیاں، سوئے جنگل کی وقت بھی سب بآگ سکھتے ہیں۔ جیسے ہر سے اندر جانکر لگے ہیں۔ یعنی یا تو اسے میں تھک گیا تھا چلتے چلتے ٹھٹکا۔ اس بکش تک جیتے کی کھال پر اپنی بلی ابل جتا توں کے سنگ انکھیں ہوندے دم روکے وہ ایسا بیٹھا تھا جیسے بن کے بیج جتا توں والا بوڑھا برگد۔ آگے نادیاں مہرا تھا، جتا توں کے بیج فاختہ نے گونسلہ بنایا تھا اور انہی سے سہرہ، ہی بھتی کر راجہ کو آتے دیکھ کر پھر بھڑائی اور اڑاگی۔ اس نے اجل پکوں کو اٹھایا اور دیکھ کے بولا:

”ہے راجہ، لے گایا دے گاؤ۔“

”یدھ کروں گا مے سکاتوں گا، دینا پڑا تو روں گا۔“

”یکسے یدھ کرے گاؤ۔“

”جلیسے ویر کیا کرتے ہیں۔ دھنس بیان جوڑوں گا اور ہلہ بولوں گا۔“

”کون سی دھنس اور کون سے ہاں؟“

”بلد علی کی دھننتی اور پرشنوں کے ہاں۔“

”پھر دھنس سیدھی کر اور بان چلا۔“

”بول کے کس کاکس سسپیٹ نہیں بھترنا؟“

”ہے راجہ! تو چیزوں کا تو چیزوں سے پیٹ نہیں بھرتا؟“

”کن تو چیزوں کا کن تو چیزوں سے پیٹ نہیں بھرتا؟“

”سائکر کانڈیوں کے بانی سے، آگئی کا ایندھن سے، ناری کا بھوگ سے، راجہ کا راج پات سے، دھنو ان کا دھن دولت سے، ددو ان کا ددیا سے، مور کھکا موڑنا سے، ایسا چاری کا ایسا چار سے، یہ سن راجہ نے اس کے چون پھوٹے ”دھینہ ہو منی ہمارا ج، میں نے تمیں سو گتوں انہیں“  
”سو گتوں کا رکیا۔ اور پوچھ۔“

”ہے منی ہمارا ج میں کیسے چلوں؟“

”سوریہ کے انجامے میں چل۔“

”سوریہ جب ڈوب جاتے پھر؟“

”پھر تو چند رہاں کے انجامے میں چل۔“

”چند رہاں ڈوب جاتے، پھر؟“

”پھر تو دیا جلا، اس کے انجامے میں چل۔“

”دیا، بجھ جاتے، پھر؟“

”پھر تو آنما کا دیا جلا، اس کے انجامے میں چل۔“

راجہ نے پھر چون پھوٹے ”دھینہ ہو منی ہمارا ج، میں نے تمیں سو گتوں انہیں اور داں میں دیں“

راجہ نے پھر وہ نش سیدھی کی۔ بان جوڑ نے لگا تھا کہ منی بولا

”راجہ! میں کہر۔“

”کس کارن بس کمروں؟“

”اس کارن کر سنسار میں گتوں مکتوڑی ہیں، پوچھنے کی باقی بہت ہیں۔“

میں نے اسے اس نے مجھے دیکھا ”کیا بالگت ہے؟“

”شانتی۔“

”رشانی؟“ اچرچ سے مجھے دیکھا۔ بھروسہ میں شانی؟“ دیکھے گیا۔

فاختہ کا گھوشنہ خالی تھا۔ سر کو جھلکا کہ انڑے گئے اور ٹوٹ گئے۔ ساتھن۔ پھر کتنے

بلاں اُٹھیں گے۔

۳۱۔ دسمبر

”دیر پڑھ رہے یا افواہ ہے؟“

”صاحب! مصدقہ پڑھ رہے۔ ساتوں بھری پڑھاں چل پڑا ہے۔۔۔“

”واقعی؟“

”واقعی، اب تو خلیج بنگال میں داخل ہونے والا ہے۔ بس اب جنگ کا پانسہ پلٹنے والا ہے۔“

شیران میں، نظیرا کی دوکان پر، ہمارے گھر میں جہاں خواجہ صاحب پل پل کی بخوبی لے کر ابا جان کے پاس پہنچتے ہیں، سب جگہ امریکے ساتوں بھری پڑھے کا چھڑا ہے۔ سو کہ دھانوں پر جیسے پانی پڑگیا ہو۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اسی مضمون کا اشتہار میں تے کیس کا دیکھا ہے کہاں؟ کس دیوار پر؟ میں شہر کی دیواریں تصویر میں لاتا ہوں۔ کون سی دیوار تھی وہ یہ دیوار دیوار دیکھتا پھرتا ہوں۔۔۔ اچھا یہ تھی وہ دیوار، شاہ بھانی مسجد کی دیوار، ایک یہاں اشتہار لگائے جس پر ڈھال اقتدار کی تصویر بنی ہے۔ خیز درج ہے کہ ایسا تیکھیں جل پڑا ہے۔ جہاں آباد پہنچا چاہتا ہے۔ خلقتِ اکٹھی ہے جیسے پورا جہاں آیا سمٹ آیا ہو۔

”اماں کیسا اخبار ہے؟ کیا اس میں درج ہے؟“

”اے صاحب! مضمون واضح ہے، ایمان کا نشکریا مارکٹ اچلا آ رہا ہے۔ بس ابھی پہنچا

سمیحو، فرنٹی کے دل لگتے ہیں۔“

”اماں نہیں؟“

”تو پھر قبلہ آپ خود پڑھ لیں۔“

”وہ اچھا ہے پھر تو بہت بیراکھری ہو گی۔“

”اے صاحب! وہ تو ہو گی۔“

”لکھ میرے عزیزنا فرنٹی کچھ منڈکا نواز نہیں ہے۔ اس کے پریوں تسلی گنگا ہوتی ہے،“

”اے حضرت! پھر ایران بھی کچھ پتلا نہیں موتنا۔ فرنٹی کو جھنپی کا دودھ سیا د آ جاوے گا۔“

جهاں آبادیں خوشی کی اہم دوڑ گئی، سو کھے دھانوں پر پانی پر پل گیا۔ یار خوشی سے پھولے

نہیں سماتے، اکٹا اکٹا کر جلتے ہیں۔

”ایے او زانتگلو، آج تو بہت اتر ایریا اے۔ سالے اپنی بنا ہوا ہے، کہیں آنکھ لڑکی گئی۔“

”ڈھڑو کے تجھے بست کی بھی بخڑھے۔“

”بخت نہیں تو تو تیادے کیا پھر تو نے کوئی اشغالہ چھوڑا ہے۔“

”ایے مخچخو، ایران آ ریا آئے۔“

”نہیں ہے۔“

در تہیں اتنا جا مسجد ہی جا، والی پر پرچار لگا ہوا ہے۔

”ایران کیا لینے آ ریا ائے یے۔“

”پچھو تیری عقل پر تو ختل پڑے گے۔ ایے وہ فرنٹی سے دودھ باخت کرنے آ ریا اے۔“

”کھا میرے سر کی قسم۔“

”تیرے سر کی قسم میں ایں سالے فرنٹی کا سارا رُعاب شُعاب ختم ہو جاوے گا۔“

”پھر تو پو بارے ہیں۔“

”پو بارے، ہی پو بارے۔“

”ایے او اودبلاؤ، تیری بنوت کس دن کام آ دے گی۔“

”موقہ تو آنے دے، بس گوالیاری پیس تیار رکھ۔ سالے سب فرنٹیوں کی کلاتیں انبار

دھوں گا۔“

لگبھیں یہاں زیادہ دیر نہیں بھڑکتا تھا۔ کہ فیو کا وقت یوقریب تھا۔ میں نے ایک رکشا والے کو روکا۔

ولہ « بالیو بلیک آؤٹ میں والپس آنا پڑے گا۔»

« یاد میں سے روپیہ زیادہ لے لینا۔»

« اچھا بیٹھ جاؤ۔»

رکشا سارٹ کرتے ہیں وہ شروع ہو گیا۔ باوجی جنگ کی کیہہ خبر ایں ہیں۔  
« کوئی نئی خبر نہیں۔»

پھر میرے سے سنوا چلیں دی فوجاں آگئی ہیں۔»

« کون کہتا ہے؟»

« ایک باقی میرے رکشائیں پڑھا، اُس نے بتایا پہنچ پڑھ رہے ہیں۔ رات کو جتنی لڑائی ہوتی ہے

جیسی فوجاں لڑتی ہیں۔»

« رات کی کیا تخصیص ہے؟»

« دن کو تو پہچلنے جاویں گے۔ رات کو جیسیں بدمل کے لڑتے ہیں۔»

« دامان یہ سبز پوش بی بی کون ہے؟»

« سبز پوش بی بی۔ ستاؤ ہے۔ ایں گل دیگر شلفت۔»

« اماں آپ شنے کی بات کرتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے۔ بس ایک غلی گولے کی طرح دشمن پہ گرتی ہے۔ خالیوں کو مولی گاہر کی طرح کاشتی جعلی جاتی ہے۔ جب معرکہ پڑھتا ہے تو غائب ہو جاتی ہے۔ مجال ہے پھر اس کا آنچھ بھی نظر آ جاتے۔»

« اسے صاحب ایرو تو بجھ باجرا ہے۔»

« اسے حضرت آپ سبز پوری کی بات کر رہے ہیں۔ پھر مجھ سے سنو۔ بندہ درگاہ نے

اپنی آنکھ سے اُسے دیکھا ہے۔»

”اماں نہیں؟“

”حضرت! بھورٹ بولے سوکا فر کا بیل دروازے والے مورپھے پر جب رن پڑا ہے تو اسے حضرت! میں بھی سر پر کفن پاندھ کو دپٹا۔ قسم علی مرضی اشیر خدا کی، وہ سالے خاکیوں کے چکے پھر طراز ہی نہیں۔ لڑتے لڑتے کیا دیکھوں ہوں کہ لیک بی بی سر سے پیر تک بیرون ہتھ پر آتاب پڑی ہوئی، ہاتھ میں تلوار، گھوڑے پر سوار خاکیوں کے دل میں گھسی ہوتی ہے۔ میں حریان کی بی بی بی کوں ہے! وہ نے جی کمال کیا۔ الیتی تلوار بار کے سر بھٹے کی طربوں اٹھ جاوے۔ وہ سالوں کے توں بکھر دیتے۔ خاک دم دبا کے بھاگے۔ جدوں لڑائی ختم ہوتی توہین نے مرٹ کے دیکھا، لوچی دے غائب۔ بہت ایصر اور دھرنظری دوڑائیں، وہ کی تو پھر پیچل نیں دھکائی دی۔“

۲۴۔ دسمبر:

آج میں شہر میں گھومتا پھرتا رہا۔ آثار اچھے نہیں۔ نقشہ شہر کا ابتر دیکھا۔ مورچوں کو ٹھنڈا پایا۔ سپاہی مورچوں میں کم اور بازاروں میں زیادہ نظر کتے ہیں، میرٹھ سے جو پورب نے شعلہ جوالہ کی صورت اٹھتے تھے اب سرد کھاتی پڑتے ہیں۔ لڈو پیرے کھلتے ہیں، جنگ گھوٹتے ہیں، جلیسیوں سے انہیں خاص رغبت ہے۔ ہر حلوائی سے پوری کچوری کے ساتھ جلیسیوں کا تقاضا ہے۔ شہر کے حلوائی پوریوں سے تنگ ہیں۔ رہے۔ سخت خان کے غازی تو میدانِ جنگ میں جو ہر دھلتے کا موقع ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دربار جو کبھی دُر بار تھا اب ادب کے ساتھ میں ہے۔ سازشوں کا وہاں جال بچھا ہے، معیر غیر معترض ہو چکے ہیں۔ دربار کی زینت میں مگر اعیار سے نگاہ بازی کرتے ہیں۔ سخت خان میدانِ جنگ کا آدمی، دربار میں اسکریات کھا گیا۔ پس سالاری کے حصے سخنے ہو چکے ہیں۔ اب مزا مغل بھی اس میں حصہ دار ہیں۔ دو ملاوی میں مرغی حرام۔ ہاں مزا عنوث بھی بیخ میں کو دپٹتے ہیں۔ تموری خون بس اب لاٹھا گناہ کی حد تک گھرم ہے۔ کچھ ان میموں کی حد تک گھرم ہے جوان کے ہتھے چڑھ گئی ہیں۔ مزا عنوث رجز خوانی زیادہ کرتے ہیں۔ جنگ کم دڑتے ہیں۔ گمراں کی رجڑ سے زیادہ حصوں پادشاہ سلامت کا یہ شرف ضامیں گوش رہا ہے:

دمدموں میں دم نہیں اب خیر بالگو جان کی  
اے ظفر! اس پوچھی شمشیر شہنشہان کی  
خداں شہر پاپنا رحم کرے بیس نے قلعے معالیٰ کی بیواروں پر دردی کھنڈی دیکھی ہے۔  
سادہ حل ایل حلی ایران کے شکر کے ہنوز منتظر ہیں۔

## ۱۵۔ وکبرہ:

ڈیورٹھی سے قدم نکالا ہی تھا کہ ایسا دھماکہ ہوا کہ سب درود بیوار حل گئے۔ لگتا تھا کہ اسی کو چے میں کسی نے گراب ماری ہے۔ آگے چلا، چاہٹی بانار میں ایک حلواتی کی دکان پر پور بیول کا بھیڑ بھر کا دیکھا۔ کوئی شوہر چاٹا ہے؟ ہم کو پوری دو، کوئی غل چاٹا ہے جیسی، جیسی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ دھماکہ کیسا ہوا تھا؟

”کیا کوت ہے رے۔“ ایک نے مٹھی بھر قلا فند منہ میں ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

”ابھی ابھی دھماکہ ہوا تھا جیسے پاس ہی تو پ دغی ہو۔“

”ماری ہو گی کسو ساس کے جزو اُن نے گراب۔“ دوسرا اپہ والی سے بولا۔

”دیکھ میاں!“ تیسرا نے غصے سے کہا:

”لڑائی بھڑڑائی جاوے بھاڑی میں ستوہ کو پیٹ پویا کر لیتے ہے۔ جامیاں۔“  
میں اپنا سامنہ کے آگے بڑھ لیا۔ یہ میں وہ جو دلی کے تحنت کی خانافت کریں گے؟  
ہر سے بھرے شاہ کے مزار اور شاہ بھانی مسجد کے پانچ کھڑا ہوں اور سونے کلک دیکھتا  
ہوں۔ یا میرے مولا! حضور نعلیٰ سیحانی کے ہوتے یہ کیسا سایہ مسجد کے بیناروں اور قلعے کی  
سریجنیوں پر کا پنٹا دیکھتا ہوں۔

ایک تنگ وھرڑاگ فیر، کر بڑی طاڑھی، میلی بھی الجھی زلفیں، سرخ انکارہ سیکھیں وخت

سے چل لیا!

”پسے ہست، دیکھتا نہیں لا شیں پڑی ہیں۔“

”لا شیں؟ کیسی لاشیں؟ کہاں ہیں؟“ میں نے اور گرد نظر ڈالی۔

فیر چپ ہوا۔ بڑا بڑا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو:

”زبان پندر کھو۔ تھیں اسرارِ الہی فاش کرنے کو کس نے کہا ہے؟“

پھر ہر سے ہر سے شاہ کے مزار کی طرف چلا۔ مزار کے پاس پہنچتے پہنچتے نظر وی سے اوچل ہو گیا۔

#### ۱۴۔ دسمبر

آج ستمبر کی ۲۱ ہے۔ قیامت کا دن۔ ستاون سنه کی سب سے ستم انگریز ساعت۔  
گھر سے باہر آیا تو شہر کو درہم و پرہم دیکھا۔ یہ دیکھ کر جیران ہو رہا تھا کہ ایک زبردست محاک  
ہوا جیسے بندوقوں کے سویں ایک ساقہ ہوتے ہوئے ہیں۔ دماغِ ختن ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ صر  
جاوں؟ پاؤں خود سخود قلعے کی طرف اٹھ گئے۔

قلعے کے دروازے پہ پہنچا تو کیا دیکھا کہ پھاٹک بند ہے، قفل رکھا ہے، نہ در بابی،  
نہ پھر سے دار۔ پھاٹک کے متصل ایک توپ نصب ہے مگر چلانے والا کوئی نہیں عقل جیران۔  
جب تھا العجیب۔ شاہ بھانی قلعے کے دروازے میں تالا۔ یہ بارے ایک صورتِ نظر آئی۔ میں  
نے اس سے پہچانا۔ یہ تو دربارِ گور بار کا در بیان ہے کہاں بھائی کا جاتا ہے؟ میں تے اسے مل کا۔ اس نے  
بھاگتے بھاگتے کہا کہ خیر پاپتا ہے تو یہاں سے چلا جا۔ خاکیوں کی پلٹن آرہی ہے۔

”اور حضورِ نعلیٰ سمجھا نی؟“

”حضرتِ نعلیٰ سمجھانی مقبرہ ہمایوں میں ہیں۔ شہزادے شہزادیاں تقریباً ہیں۔ جس کے ہمارا  
سینگ سماستے نکل گیا۔ تعلق خالی ہے، بھائیں بھائیں کہنا ہے۔“

میں پلٹ دیا۔ رستے ہو چکر رہے تھے مگر دور سے توپوں کے دغنشی کی آوازیں آرہی  
تھیں۔ کبھی اس راہ، کبھی اُس راہ۔ کبھی کسی پہنچتے میں، کبھی نعلیٰ سڑک پر۔ کبھی رہست یہاں سے  
وہاں تک خالی۔ کہیں لوگ مر ایسہ بغلوں میں پولیاں دیا۔ میر کو تیچھے لٹاگئے بھاگے پلے۔

بالتے میں بچا وڑی میں اور نفشنہ دیکھا۔ لوگ لٹھ پونگے لئے کھڑے ہیں۔ ایک چارپائی کی بیٹی  
لئے گھر سے نکلا اور صرف میں آن شامل ہوا۔ دوسرا چکنی سے مسلح گھر سے بدآمد ہوا اور بیازو  
تو تباہی سچ سڑک پر آئی ڈالنا۔

میں نے قریب جانکر رانی عمارت پوچھا:

”عزیزی کیا نیت ہے؟“  
”چکنی والے نے کڑک کر کہا:  
”لڑپیں گے؟“

میں نے چکنی والے، پھر چارپائی کی بیٹی والے کو حیرت سے دیکھا اور آگے بڑھ لیا۔ پھر  
خود میں یہ رفت رفع ہو گئی مخفیک ہے، لٹھنے والے چکنی چھٹے اور چارپائیوں کی پیشوں سے  
بھی لٹھ لیتے ہیں۔ جنہیں نہیں لٹھنا ہوتا وہ تیار توپوں اور بھری بندوقوں کو چھوڑ کر جھاگ کھڑے  
ہوتے ہیں۔

جامع مسجد کے سامنے سے گرد رتے گزرتے ٹھٹکا۔ سکتے میں آگیا۔ لاشوں کا فرش بچا  
ہوا تھا۔ ہر سے بھرے شاہ کی طرف سے غضب ناک آواز آئی:

”تجھے کس نے کماک بیان ہٹھرے۔ چلا جا۔“

ادھر نظر گئی۔ وہی ننگ دھرم ننگ بخوب سیدن میں رعشہ آگیا۔ یہ قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔  
پھر بالکل ادھر ادھر نہیں دیکھا۔ بس گھر کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔  
گھر بین اسی جان بیٹھی دھاروں رو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کے ان کی حالت اور غیر معمونی  
”بیٹے! بتول کا کیا بنتے گا۔“

ابا جان صبر و سکون سے بیٹھے تھے مجھے دیکھا اتنا مل کیا، بولے:

”یہ خبر صحیح ہے؟“

میں کیا بجا ب دینا، جتنا سب کو معلوم تھا، اتنا ہی مجھے معلوم تھا۔ سوچ کر میں نے کماک